ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری* ڈاکٹر ولی محمد**

# صنفِ ریختی کا تہذیبی مطالعہ

**Abstract:** *Rekhti is an important genre of Urdu poetry which was first initiated in Urdu by Hashmi Bejapori (Dakhan). Although our critics and writers of Urdu poetry did not give serious attention to this genre and condemned it, (specially Lucknowi Rekhti) but it has a great cultural and lingual importance in the view point of the researchers. In this research paper the researchers have shed light on the definition and cultural importance of Lucknowi Rekhti in full detail.*

عورتوں اور مردوں میں جنس ،جذبات اور احساسات، ثقافتی مقام و مرتبہ اور ذمہ داریوں کے اختلاف کی وجہ سے ان کا روزمرہ اور محاورہ اور طرزِ اظہار بھی مختلف رنگ اور روپ اختیار کر لیتاہے۔ہندوستانی سماج میں عورتوں کی سماجی حیثیت اور سماجی ذمہ داریاں ، ان کا صنفی کردار اور فرائض مردوں سے مختلف رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عورتوں کی روزمرہ گفتگومیں اس فرق کی جھلک بآسانی مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی تہذیب نے عورت کو ہزار پردوں میں چھپا کر رکھاہے۔سماجی اقدار کے بوجھ تلے سانس لیتی ہوئی عورت جب مخصوص قسم کے جذبات و احساسات کا اظہار کرتی ہے تو مجبوراً رمز و کنایہ سے کام لینا پڑتاہے۔اسی وجہ سے اردو کے کچھ الفاظ اور محاورات عورتوں کے لیے ہی مخصوص ہو گئے ہیں ۔(۱)

روزمرہ اور محاورہ میں اسی صنفی فرق و اختصاص کا نتیجہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی زبان کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے ہیں۔اردو زبان میں یہ دونوں رنگ روزمرہ، محاورات بلکہ ضرب الامثال میں بھی بآسانی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ڈاکٹر صابر علی خان کا اس ضمن میں ماننا ہے کہ اردو زبان کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عورتوں اور مردوں کے روزمرہ اور محاورہ میں نمایاں امتیاز موجود ہے۔جو دنیا کی بیشتر زبانوں میں بہت کم ملے گااورصنف ریختی کا مقصد عورتوں کی اس مخصوص زبان میں ان کے جذبات کی ادائیگی ہے ۔(۲)

* یونیورسٹی آف چترال، چترال

** شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی پشاور۔

جب ہم لکھنو کی ریختی پیش نظر رکھتے ہیں تو ہمیں یہ ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ ریختی سے مراد تمام عورتوں کے جذبات کی ترجمانی نہیں ہے۔یا عورت کے تمام جذبات کی ترجمانی نہیں ہے ،بلکہ مخصوص عورتوں کے مخصوص جذبات کی مخصوص زبان میں ترجمانی ہے۔ورنہ عورت کی طرف سے اظہار محبت کو ریختی قرارد یاجائے تو پوری کی پوری ہندی شاعری اس معیار پر پورا اترتی ہے۔ایسا کہنا صحیح نہیں ہو گا۔کیونکہ ہندی شاعری اپنی اس خصوصیت کے باوجود اکثر و بیشتر پاکیزہ اور مقدس جذبات اور خیالات کی ترجمان ہے۔جبکہ( لکھنوی) ریختی کا مقصد محض شہوانی و نفسانی جذبات کی برانگیختگی ہوا کرتی تھی۔ورنہ کسی ادب پارے کے لیے عورتوں کی زبان کا استعمال کوئی غیر معمولی یا نئی چیز نہیں ۔(۳)

اس بنیاد پر کہاجاسکتاہے کہ ریختی کی زبان شریف عورتوں کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔یہ شریف مسلمان گھرانوں کی عورتوں کی زبان ہی نہیں ہوتی بلکہ طوائف کے کوٹھوں کے کلچر کی مخصوص اور نمائندہ زبان ہوتی ہے۔جس میں بے باکی ، بے حیائی ، لچر پن اور بازاری پن کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔مرزا محمد عسکری کے خیال میں ہم نے شریف گھر کی عورتوں کے منہ سے وہ بولی کبھی بھی نہیں سنی جو ریختی میں مصنوعی طور پر بولی جاتی ہے۔ریختی کی زبان مسلمان عورتوں کی عام زبان نہیں ہے ۔(۴)بلکہ طوائف کی روزمرہ زندگی میں مستعمل زبان ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ محاورات اور روزمرے جن کی تفصیل رنگین نے دی ہے۔وہ ان لوگوں کی سمجھ میں بالکل نہیں آتے جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک خاص حصہ لکھنو میں طوائف کے کوٹھوں پر نہ گزاراہو۔(۵)

یہیں سے وہ بنیادی ٹیڑھا پن شروع ہوتاہے جو لکھنوی ریختی کے موضوعاتی ایوان کی بنیادوں میں کجی کا باعث بنا ہے اور جس کی وجہ سے ریختی جیسی منفرد صنف سخن شرفا ، خواص ، سنجیدہ اور پڑھے لکھے قارئین و ناقدین کی توجہ حاصل کرنے سے محروم رہی۔یہاں کہنے کامطلب یہ نہیں ہے کہ طوائف کے کوٹھوں کی زبان کو اردو ادب میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔لیکن صرف طوائف کے کوٹھوں کی زبان ہی کو صنف ریختی کی صورت میں جگہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی وہ اکثریت جو پہلے ہی شعر و ادب میں گونگی بہری تھی جن کی آواز اس سے پہلے اردو شاعری میں نہیں سنی گئی تھی ریختی میں بھی ان کی آواز ، ان کے جذبات ، احساسات اور مسائل سے چشم پوشی کی گئی۔لہٰذا یہ صنف اکثریت کی عورتوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمان نہ بن سکی۔دوسری بات یہ کہ یہ مرد کی عینک سے عورتوں کے جذبات کی ترجمانی تھی۔ جس میں صنفی امتیاز کے عنصر کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔اس کے ساتھ ساتھ یہ صرف اوباش عورتوں کے مخصوص جذبات کی ترجمان بن گئی۔ڈاکٹر صابر علی خان کے بقول تو ریختی سے مرادہی ایسی شاعری ہے جس میں عورتوں کی زبان میں اوباش اور آوارہ عورتوں کے جذبات و معاملات بیان کئے جائیں ۔(۶)یہ جذبات اگر عورت کی زبان سے بیان کیے جاتے تو بھی

کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن یہ مردوں کی زبانی بیان ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان میں اوریجنلٹی کی سخت کمی دکھائی دیتی ہے۔بعض مقامات پر خود ان کے تخلیق کاروں نے ریختی کے حوالے سے اپنی تخلیقات کو جابجا بکنے اور اپنے منہ پھٹ ہونے کا نتیجہ قرار دیاہے۔ان کے ان بیانات کو دیکھ کر ریختی کے حوالے سے کوئی صحت مند رائے قائم نہیں ہوتی اورہمارے دل میں یہ خیال پیدا ہوتاہے کہ جس طرح وقت گزاری کے لیے اورایک دوسرے کو محظوظ کرنے کی خاطر گپ شپ میں دوست لچر اور ناشائستہ لطائف سے محفل کو گرماتے ہیں ان کی ریختیوں کا مزاج ان سے ملتا جلتا معلوم ہوتاہے۔اسی عدم سنجیدگی کے زیرِ اثر ریختی میں عورت اور مرد کے جسمانی و جنسی تعلق کو فکر و کلام کا بنیاد بنایاگیاجس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوخی و سرمستی کے ساتھ ساتھ ابتذال کا عنصر شروع سے ہی اس صنف میں غالب رجحان کے طورپر موجودرہا۔(۷)

لکھنوی ریختی میں عورتوں کی زیادہ تر منفی تصویر پیش کی گئی ہے۔اس صنف میں بے شک طوائفو ں کے جذبات اور احساسات کا اظہار ہوتا لیکن انہی کی زبان میں ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ایسا بھی نہیں ہے کہ اردو میں طوائف شاعرات کی کوئی کمی ہے ۔ماہ لقا چند ا اور اس کے بعد طوائفو ں کی ایک کھیپ نے شاعری کی ہے لیکن بہت کم شاعرات نے ریختی میں قدم رکھا ہے۔بیشتر طوائف کے ہاں زنانہ لہجے کی بھی کمی دکھائی دیتی ہے بلکہ انہوں نے غزل کی عام روایت کے مطابق مردانہ لہجے میں غزلیں لکھی ہیں۔لہٰذا ان کے ہاں بھی اس اوریجنلٹی کی شدید کمی دکھائی دیتی ہے جو مثلاً ریختی گوشاعروں کی ریختی میں ملتی ہے۔ریختی میں مسئلہ یہ ہوا ہے کہ اوباش عورتوں کے مسائل کو اوباش مردوں کی زبانی اظہار کا راستہ ملا جس میں صنفی امتیاز اور عدم سنجیدگی نے مبالغہ کے پیدا ہونے اوریوں حقائق کی شکل و صورت مسخ کرنے کے عنصر کو داخل کرنے کے لیے راستہ ہموار کیا۔

لکھنوی ریختی کا تفصیلی موضوعاتی مطالعہ کرنے کے بعد اس کے متعلق جو رائے قائم ہو تی ہے اس میں منفیت کا عنصر بھی شامل ہوتاہے لیکن اس کے وہ اشعار یقیناً قابل قدر ہیں جس میں اس مخصوص طوائفانہ کلچر کے مختلف رنگ اور عورتوں کی زندگی اور ان کی نفسیات کے وہ حوالے جو کلاسیکی مردانہ غزل میں ناپید تھے ، زنانہ غزل میں محفوظ ہو گئے ہیں ۔ان رنگوں میں بعض رنگ کثیف بھی ہیں ،جن میں ابتذال اور سوقیانہ پن موجود ہے۔لیکن ان میں تلخ اور ناقابل ہضم حقائق کو پیش کیا گیاہے جو قابل تعریف ہیں۔ریختی سے نفرت کے جو حوالے بنتے ہیں ان کے رنگ منٹو کے متنازعہ افسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔جو آپ کے اعصاب کو جھنجھوڑتے بھی ہیں اور آپ کے دل میں مصنف کے لیے بعض اوقات کبیدگی کا سامان بھی پیدا کرتے ہیں۔جنہیں آپ مخرب اخلاق کہہ کر ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں اور جن کی تلخ حقیقت نگاری آپ کو حیران و پریشان کرنے کے ساتھ ساتھ موضوعاتی جدت کے حوالے سے عظمت کا احساس ابھارنے

پر بھی مجبور کرتی ہے۔ جنہیں آپ ٹھوکر بھی مارتے ہیں اور گلے بھی لگاتے ہیں۔ اگر چہ ریختی میں وہ درد اور وہ سنجیدگی ناپید ہے جو مثلاً منٹو کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت اور افسانے کی دنیا میں ان کی عظمت کی ضامن ہے، لیکن اس میں ان گلیوں اور کوٹھوں کی بو (بدبو) بڑی آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے جس سے ہمارا منافقانہ بنیادوں پر اٹھا ہوا معاشرہ نفرت کرتا چلا آیا ہے۔ شعری دنیا اور بالخصوص غزل میں ان موضوعات کا اس کھلے اور بے باکانہ انداز سے اظہار کلاسیکی غزل کی روایات کے برعکس تھا۔ لیکن نیا اور اچھوتا ضرور تھا۔ اس قسم کے مضامین کے حامل اشعار ریختی جیسی طوائفانہ صنف میں پیش کیے جاسکتے تھے اور ان مضامین کا اس انداز سے استعمال اردو غزل میں ناپید تھا۔ مثلاً

باندی کو میری پیڑو کھجانے کی ہے عادت
ہے نافے سے پاجامہ جو نیچے اتر آیا (۸)

کمر کا ہووے جو مضبوط وہ دکھائے مزا
مجھے تو اتنوں میں کوئی نظر نہیں آتا (۹)

ہرگز نہیں نگوڑے خصم میں ذرا وہ بات
اس دل کے جو نکالے گا ارمان آشنا (۱۰)

نوج بلواؤں اسی اوہی وہ قربان کیا
جس نے اس طرح مجھے رات کو ہلکان کیا

تڑپی مچھلی کی طرح سینکڑوں چیخیں ماریں
میری ایذا کا نگوڑے نے نہ کچھ دھیان کیا (۱۱)

یہ لال میرے ہونٹ کیے چوس چوس کر
صاحب رہی نہ بیڑے جمانے کی احتیاج (۱۲)

بدگمانی دیکھنا میں جو گئی بیت الخلا
پیچھے پیچھے آگیا لے کر موا بدظن چراغ (۱۳)

یہ مضامین ہمارے شائستہ مزاج کے خلاف ہیں۔اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادب کو انسانی جذبات کی تطہیر کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے۔لیکن ادب کاایک کام انسانی مسائل کی ترجمانی بھی ہے۔طوائف کی صورت میں یہ گھسا پٹا طبقہ جس سے انسانیت مسلسل نفرت کرتی چلی آئی ہے اور جس کا ہمیشہ سے استحصال ہوتا چلا آیاہے اگر ان کی زندگی اور ان کے مسائل کی ایک ایسی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے جس سے ان کی کسمپرسی پر کوئی روشنی پڑتی ہے اور ان کی زندگی کے تلخ زاویے قارئین کے سامنے آتے ہیں اور قارئین ان سے آشنائی و شناسائی حاصل کرلیتے ہیں اور انہیں اس طبقے کی محرومیوں ، نفسیاتی پیچیدگیوں ، الجھنوں اور مسائل کا تھوڑا بہت اندازہ ہوجاتاہے تو یہ بات یقیناً قابل قدر ہے۔یہ بات درست ہے کہ طوائف جب بازارِ حسن میں داخل ہوتی ہے، تو اس کے پس منظر میں کچھ درد انگیز کہانیاں بھی ہوتی ہیں یا بعض اوقات ایسی صورت بھی ہوتی ہے کہ کوئی عورت ذہنی طورپر طوائف ہوتی ہے اور وہ اس میدان میں قدم رکھتی ہے۔دونوں صورتوں میں اس کے ذہن کی گتھیاں سلجھا کر اس کے نفسیاتی و سماجی عوارض کی تشخیص و تفہیم اور علاج ممکن ہے۔مثلاً اوپر نقل کئے گئے اشعار میں سے پہلے والے دواشعار جنسی حوالے سے ایسی متحرک اور فعال عورت کی نشاندہی کرتے ہیں جس کی جنسی بھوک زیادہ ہو۔ اگلے دو اشعار عورت کی جنسی حوالوں سے بے بسی اور مجبوری کی ترجمانی کرتے ہیں ، جہاں مرد جنسی حوالوں سے غاصب اور فعال ہے۔اور عورت مجبور اور بے بس ہے ایسی حالت میں اس کی ذہنی کیفیت بڑے اچھے طریقے سے آشکارا کی گئی ہے ۔آخری شعر اس حقیقت کی نمائندگی کرتاہے کہ کس طرح ہم عورت پر کڑے پہرے بٹھاتے ہیں اور مرد کو آزاد چھوڑتے ہیں۔عورت شکوک و شبہات میں گھری رہتی ہے اور مرد آزادی کے ساتھ اس جرم کا مرتکب بنتاہے۔مردکو سرے سے کوئی پشیمانی نہیں ہوتی حالانکہ وہ بھی اسی جرم کا مرتکب بنتاہے جس جرم کے لیے وہ عورت کو شک کی نظر سے دیکھتارہتاہے۔

بازارحسن کی اقدار، روایات ، مقررات اور معیارات باقی سماج سے مختلف ہوتے ہیں۔افلاطون نے کہا تھا کہ ہر شہر کے اندر دو شہرہوتے ہیں ایک غریبوں کا شہر اور دوسرا امیروں کا شہر۔اور دونوں کے عادات و اطوار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔لیکن شہرکے اندر رہتے بستے اس تیسرے شہر کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔جسے بازار حسن کہتے ہیں۔یہاں کی عادات و اطوار بھی باقی دنیا سے مختلف ہوتے ہیں۔جو باتیں باہر سماج میں نفرت کے قابل ہیں وہ یہاں قابل تحسین و ستائش ہیں۔یہاں جسم کا سودا ہوتا ہے اور اقدار جسم کے تقاضوں کی بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں۔مثلاً اس قسم کے مضامین کلاسیکی غزل میں اتنی کثرت سے نہیں ملیں گے جس طرح کہ ریختی میں بہتات سے ملتے ہیں۔

دو روپے بھی گر نہیں تھے پاس دینے کے لیے
اشرفی خانم بہو کا تو نے منہ دیکھا عبث (۱۴)

یہاں روپوں کے عوض جسم خریدے جاتے ہیں۔انسان خریدے جاتے ہیں۔ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ عارضی طور پر ۔کچھ مدت کے لیے کچھ لمحوں کے لیے۔لہٰذا جسم سے لطف اندوز ہونے کا عنصر باقی تمام جذبات پر مقدم ہے۔دوسری عزیز شے روپیہ ہے۔

پاس پیسا تھاجی کوڑیا خانم جب تک
گھیرے رہتے تھے میری بٹی کو ہر آن عزیز (۱۵)

لب اپنے چوستی ہوں میں لب ان کے چوم کر
بوسے بڑے لطیف کسی کے دہاں کے ہیں (۱۶)

ریختی کا تہذیبی حوالے سے ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس میں طوائفانہ کلچر کے کچھ تلخ حقائق اور مختلف تہذیبی رنگوں کی عکاسی کامیابی کے ساتھ ہوئی ہے۔مثلاً رقص یا مجرا اس کلچر کا ایک اہم اور ناگزیر عنصر ہے جس کے ذریعے طوائف اپنے گاہکوں کو محظوظ کرتی ہے۔

اے میاں ناچ نہ موقوف ہو سارے مہماں
دیکھ لیں اور مزاآج کے دن آج کی رات (۱۷)

ریختی کی تخلیق جس دور سے تعلق رکھتی ہے ،اس میں موبائل اور ٹیلی فون کااستعمال نہیں تھا۔خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھااور طوائف اپنے عاشقوں تک پیغامات پہنچانے کے لیے ماماؤں سے کام لیتی تھی۔مامائیں بھی بعض اوقات چالاکی کا مظاہرہ کرتی تھیں تاکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ فوائد بٹور سکیں یا ان کے عاشقوں کو لوٹ سکیں۔عاشق اگر بالفرض ناراض ہوگیاہے یا فاصلے پیدا ہوگئے ہیں اور اس کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے ہے تو طوائفوں کے لیے ان کا منانا ضرور ی بھی ہوتا تھا۔یا بعض اوقات عورت کسی کے ساتھ دل لگی کرتے کرتے سچی محبت میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ایسی کیفیات کی عکاسی بھی ریختی میں موجود ہے۔مثلاً

یہ خط نواب کو پہنچا دو، ماما میں واری
بنالو روپ بوا آج نامہ بر کا سا (۱۸)

ماماجی واری جاؤں کرو آج شاد وصل
ہو بیٹا بیٹیوں کی تمہیں شادیاں نصیب (۱۹)

طوائف کے کوٹھوں کے عاشق بھی ناقابل اعتبار ہوتے ہیں۔ان میں سے اکثریت ایسوں کی ہوتی ہے جن کی اپنی بیویاں اور داشتائیں ہوتی ہیں لیکن جنس کے بھول بھلیوں میں گم ایسے ہوس پرستوں کو نئے جسم ٹٹولنے کی خواہش ہوتی ہے ۔طوائف کو ایسے حالات میں بھی سمجھوتہ کرنا پڑتاہے کہ وہ مرد کے جسم میں شریک کو برداشت کر سکے۔اسے کوئی نواب یا جاگیردار دوسری رنڈیوں اور متاعیوں کی موجودگی میں بھی رکھ لیتاہے ،وہ یہ سب کچھ اس لیے برداشت کر لیتی ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔

دو سوتیں ہیں دو رنڈیاں ہیں تین متاعی
پیدا تو کوئی کرلے ہمارا سا جگر آج (۲۰)

اس کو رکھا ، اس کو چھوڑا ، ہے نگوڑا بے وفا
چھوٹتے ہی اور کرلی مجھ سے بہتر دیکھ کر (۲۱)

زمانے کا مزاج دیکھ کر طوائف بھی خلوص اور وفا کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور محض دولت کی لالچ میں ایک نہ ایک مرد کو اپنے دام میں پھنسائے رکھتی ہے اور بیک وقت بھی کئی ایک کو پھانسنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔عارضی طور پر جنسی تعلق قائم کرلینا چاہے شادی کی صورت میں ہی کیوں نہ ہو طوائف کا وطیرہ بن جاتاہے۔

جانی بیگم کا تو یہ پانچواں ہے موتی جان
تیسرا کر لیا تم نے بھی تو آفت کیا ہے (۲۲)

لکھنوی معاشرے پر مرد کے جذبات و احساسات کا غلبہ ہے۔اس ماحول میں بھی عورت کی جذباتی تضحیک کے لیے کچھ کم سامان موجود نہیں ہے۔ایک عورت جب معاشی مجبوریوں یا تقدیر کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر جسم بیچنے پر مجبور ہو جاتی ہے تووہ مرد کی نظروں سے گر جاتی ہے۔

اب نظر میں ان کی میں چڑھتی نہیں
دل سے اتری جب سے چکلا ہوگیا (۲۳)

طوائفوں کے ساتھ ساتھ متاعیوں کا تذکرہ بھی ریختی میں ملتاہے۔چونکہ لکھنو کی اکثریت شیعہ مسلک سے متعلقہ ہے۔اس لیے متاعی کا تذکرہ ریختی میں اس کلچر کے مخصوص عنصر کی نشاندہی کرتاہے۔

سنوایئے متاعی کو بھی ہارمونیم
مجرے چمن میں آپ کی امراؤ جاں کے ہیں (۲۴)

صاحب استطاعت لوگ باقاعدہ طور پر عورتوں(رنڈیوں) کو رکھتے ہیں جو ان کے نوابانہ آن بان کا ایک ضروری تقاضا ہوتاہے۔حالانکہ ان کی بیویاں بھی ہوتی ہیں۔ایسی صورت میں کچھ مخصوص اقدار شکست و ریخت کا شکار ہوجاتے ہیں۔

رکھتے لالا ہیں رنڈیاں گھر میں
گھر کی بیوی کے سامنے یہ غضب (۲۵)

ایسے میں کوئی بیوی شکایت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اپنے شوہر کے جسم کی وہ اکیلے مالک ہو۔شوہر سے فرمائش کرتی ہے۔تو شوہر کا ردعمل کچھ یوں ہوتاہے۔

رنڈی کے چھوڑنے کو جو کہتی ہوں چھیڑ کر
دیتے ہیں گالیاں مجھے ہنس کر جواب میں (۲۶)

طوائفوں میں کوئی نئ نویلی یا کوئی شریف النفس طوائف شراب نوش کیے ہوئے گاہکوں کے سامنے جانا پسند نہیں کرتی لیکن نائکہ کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے۔ایسی طوائفوں کی نفسیاتی کیفیات کی بھی بڑی کامیاب ترجمانی کی گئی ہے ۔ایک طوائف کا یہ کتنا معصومانہ انداز ہے :

نوج ایسوں کے کنے نائکہ اماں جاؤں
جو شرابیں پیے مخمور ہوئے بیٹھے ہیں (۲۷)

نوابوں میں سے اکثریت کا مقصد عورت کے جسم تک رسائی ہوتاہے۔عورت بھی اس کے ان ارادوں کو بھانپتی ہے ۔ایسے میں اس کی دلی کیفیت کیاہوتی ہے۔

کسی ڈھب سے نگوڑی آجائے
جانتی ہوں نواب کا مطلب (۲۸)

اور جب ایک ہی آشیانے کی تلاش بے سود ثابت ہوتی ہے توپھر وہ ہر گھاٹ پر پانی پینے کے لیے تیار ہوجاتی ہے ۔اس کی کیفیت کچھ یوں ہو جاتی ہے۔

ایک دل کس کو نہ دیں کس کو دیں
لینے والوں کی ہے بھرمار بہت (۲۹)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریختی میں صرف منفی رخ ہی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ زندگی کے مثبت رویوں کو اپنانے کی ایک شدید لیکن دبیز صورت میں خواہش ریختی میں محسوس کی جاسکتی ہے۔یہاں منفی سے بیزاری کا عنصر بھی موجود ہے اور مثبت کی طرف لپک کی شدید خواہش بھی۔اس لیے اس میں سماج کے ایسے تلخ حقائق بھی پیش کئے گئے ہیں جس میں طوائفانہ طرزِ زندگی کے گھناؤنے رخ سے بیزاری کا جذبہ شدت کے ساتھ ملتاہے۔مثلاً

گئی تھی دیکھنے باجی میں سورج کنڈ کا میلا
بچی ہوں پستے پستے مردووں کا یہ ہوا ریلا

لگے دھکے پہ دھکے ایسے انگیا ہو گئی پرزے
مری پتھر کی چھاتی تھی ستم میں نے جو یہ جھیلا

مجھے کسبی سمجھ کر گھورتا تھا مجھ کو میلے میں
مہینوں بائی جی لڑکا مری گودی میں جو کھیلا (۳۰)

بن کے بگڑی بات کیا قسمت ہے تاراجان کی
چاند سا بر آکے دروازے پہ کیسا پھر گیا (۳۱)

کس کو سمجھاؤں خرابی ہے مری دونوں طرح بھائی
پر زور ہے چلتا نہ خصم پر اپنا (۳۲)

اپنی ہی گودی میں کھیلا ہوا بچہ جب ایک طوائف کو طوائف کی نظر سے دیکھنے لگے تو طوائف کے جذبات کو ٹھیس ضرور پہنچتی ہے۔شوہر کی تلاش اور اس کی آرزو بھی طوائف کے لاشعور کا حصہ ہوتاہے اور ان میں سے اکثریت اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہیں لیکن نکل نہیں پاتیں۔اسی طرح ایک طوائف شوہر اور بھائی دونوں کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتی ہے جب دونوں ہی اس کے جسم بیچنے پر آمادہ ہوں۔ریختی میں کچھ ایسے تلخ حقائق بھی محفوظ ہوگئے ہیں۔جس سے

طوائف کی زندگی کے کچھ مزید المیوں پر روشنی پڑتی ہے۔مثلاً بڑھاپا طوائف کے لیے بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔بازار حسن میں حسن کے زوال سے بڑھ کر المیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کرتی ہے کنگھی چوٹی بڑھاپے میں بیگما
رسی زناخی جل گئی لیکن نہ بل گیا (۳۳)
دولہا نے جب دلہن کو زناخی کیا سوار
ہمجولیوں کے رونے سے کہرام ہو گیا (۳۴)

ان ریختیوں میں اقدار کا بھی ایک سلسلہ موجود ہے۔مثلاً لباس کے حوالے سے طوائف جیسا لباس پہننے سے اجتناب کی تعلیم دی گئی ہے۔

نہیں اگر ساس نند تو کیا ہے یوں بھی مجھ پر عذاب آیا
خصم ہے ایسا موا لڑاکا ، ستاتا کیا کیا نہیں ہے آکر
یہ کس سگھڑ نے سکھائی تجھ کو، ہے کسبیوں کی سی اونچی کرتی
کھلا ہے پیٹ آدھا اوئی نگوڑی ذرا حیا کر ذرا حیا کر (۳۵)

ان مردوں پر تنقید کی گئی ہے جو شادی کے بعد بھی اپنے شہوانی جذبات کے ہاتھوں مغلوب در در کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں۔اس رویے سے نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔اور ایسے مردوں کے متعلق کہا گیا ہے:

کرے گا خاک موا بے وفا وفا کا لحاظ
نہ بوڑھی اماں کی جس کو ہو التجا کا لحاظ
نہ جس بشر کے ہو دل میں بوا خدا کا لحاظ
کرے گا خاک نگوڑا نکاحتا کا لحاظ (۳۶)

اس کے ساتھ ساتھ کچھ مخصوص سماجی رنگ، چھوٹی موٹی چوریاں، کچھ شگون، کچھ مذہبی اعتقادات اور رسومات کا تذکرہ، خانگی مسائل اور کچھ سیاسی مسائل (انگریز استعمار سے نفرت) کی ترجمانی بھی ریختی میں پائی جاتی ہے۔

ماں سے ہمکو سوا ہے پیاری ساس
باجی ، دنیا ہو اور ہماری ساس

جوہر ان کے کھلے ہیں بھوؤں پر
چھریاں نندیں اور کٹاری ساس
بولوں بڑھ کر تو ذبح کر ڈالے
ہے وہ جلادنی ہماری ساس (۳۷)

کوڑھ ان چھاتیوں سے ٹپکے اسے جو پہنے
میں تو کوسوں گی مری جس نے چرائی انگیا (۳۸)

خوب بھڑکایا تھا اس کو سوت نے
میں ہوئی جب گرم ٹھنڈا ہوگیا (۳۹)

ہو خیر دلہن دولہا کی ماتھا مرا ٹھنکا
اچھا نہیں ہے ٹوٹنا سہرے کی لڑی کا (۴۰)

کنگلی تھی بی زناخی بڑی آدمی ہوئیں
اب کیا ہے میرے گھر انہیں آنے کی احتیاج (۴۱)

نہ دیکھ دولھا کو ساس نندوں کے آگے گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر
نئی نویلی دلہن ہے بچی ابھی تو دوچار دن حیاکر (۴۲)

کی زناخی نے کی داماد دودن خاطر
کیا نئی بات ہے سب رکھتے ہیں سامان عزیز
آج نو چندی محرم کی ہے درگاہ چلیں
حاضری کا اجی کرلیویں گے سامان عزیز (۴۳)

خدا ہی ان ماروں سے بچالے، پڑے ہیں گورے کو جاں کے لالے
لگاتے ہیں ان کے پیچھے کالے، یہ زلفیں جب ہم سنوارتے ہیں(۴۴)

مجھے کہتا ہے کہ شراب پی، بھلا یہ بھی ہے کوئی دل لگی
موا کرتا ہے مجھے دوزخی ، یہ نگوڑا کوئی گنوار ہے (۴۵)

الٰہی سوت کے گھر سے ملا ہو میرا گھر
جو در ہو بند ادھر کا ادھر دری ہو جائے (۴۶)

لکھنو میں نشے کا استعمال بھی موجود تھا۔ ریختی میں اس دور کے کچھ نشوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو اس دور کے لکھنوی کلچر کا حصہ تھے۔ مثلاً اردو غزل میں شراب کا ذکر بے تحاشا ہوا ہے لیکن ان میں سے زیادہ تر شاعروں نے فارسی غزل کی تقلید میں ایسا کیا ہے۔ اس کے برعکس لکھنو میں استعمال کیے جانے والے بیشتر نشے بڑے کھلے انداز سے ریختی کے موضوعات کا حصہ بنے ہیں۔ جس سے اس زوال آمادہ تہذیب پر بڑی خوبصورتی سے روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً حقہ، چرس اور افیون کے استعمال کے حوالے سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان اشعار میں گھر کی عورتوں اور طوائف پر ان نشوں کے منفی اثرات بھی کسی حد تک ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

بوا مغلانی بھی کیا خوب ہے حقہ نہ چھوا
موئی بیگم کو تو چانڈو بھی پلا دیتے ہیں
لطف کیا کیا میاں پینک میں دکھاتے ہیں مجھے
موئی چنیا کو وہ جب منہ سے لگا دیتے ہیں
دم بوا ناک میں کر دیتے ہیں شب بھر میرا
ایک دم چرس کا جس دم وہ لگا لیتے ہیں (۴۷)

کھا کر افیم سو نہ رہوں میں تو کیا کروں
رہتے ہیں آپ پینکِ افیونِ ناب میں (۴۸)

جب سے بیگم پڑی افیونی موئے کے بس میں
جانتی ہی نہیں دکھیا شبِ راحت کیا ہے (۴۹)

پڑ کر کے شیخ جی کے گھر میں نگوڑی چینا
چانڈو پلانے میں اب طرار ہو گئی ہے (۵۰)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس صنف کی اہمیت کے کئی ایک حوالے بنتے ہیں۔ مثلاً اس کے ذریعے عورتوں کے جذبات (منفی ہی سہی) کی ترجمانی کے لیے راستہ ہموار ہوا۔ اردو ادب میں ہندی دوہوں اور گیتوں کی توانا اور صحت مند روایت کے کٹ جانے کے بعد عورتوں کے جذبات کے اظہار کو نکاس کا راستہ بہت ہی کم ملا تھا۔ جیسا کہ ذکر ہوا ہے کہ

قدیم ہندی گیتوں کی تخلیق کے زمانے میں چونکہ ہندوستان کا سماجی ڈھانچہ اقدار کے ایک مختلف سلسلے پر قائم تھا اس لیے عورت کی طرف سے اظہار محبت کا حوالہ عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کے لیے میدان ہموار کر دیتا تھا لیکن مسلمانوں کے ورود کے بعد شعر و ادب کی تخلیق میں مردانہ جذبات و احساسات کی ترجمانی حاوی رہی۔اس کی ایک وجہ تو فارسی شعر و ادب کا اثر تھا اور دوسری وجہ وہ مذہبی ، سماجی اور ثقافتی اقدار، معیارات اور مقررات تھے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے ورود کے بعد پروان چڑھے اور جس کی بدولت وہ ماحول تیار ہوا جس کی وجہ سے ہندی دوہے اور گیت کا اثر آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوا اوراس کی جگہ مسلم آمیز روایات و اقدار نے لینی شروع کی۔لکھنوی ریختی کو اس کا ایک ردعمل بھی قرار دیا جاسکتاہے۔جس نے کجرویانہ انداز میں عورت اور بالخصوص طوائف کے مسائل اور جذبات کی ترجمانی کی۔

لکھنوی ریختی کی بدقسمتی تھی کہ یہ ایک زوال آمادہ تہذیب کے پروردہ کچھ غیر سنجیدہ شاعروں کی ایک غیر سنجیدہ کوشش تھی۔تمکین کاظمی اس صنف سخن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ حسن پرستی اور شہوت پرستی بعد کو ایک خاص طرز میں ظاہر ہوئی جس کا نام ریختی یعنی عورت کی زبان کہا گیا۔معلوم ہوتاہے کہ یہ لفظ ریختہ سے نکلاہے اور اس کا مونث ہے عورتوں کی زبان بالذات کوئی مذموم بات نہیں مگر خرابی یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار جذبات نفسانی کو برانگیختہ کرنے کی غرض سے کہے جاتے تھے اور اس وجہ سے وہ نہایت فحش اور مخرب اخلاق اور شرفا کے کانوں تک کو ناگوار ہوتے تھے ۔"(۵۱)

یوں ریختی تمام لکھنو کی نہیں بلکہ لکھنو کی مخصوص ذہنیت کی پیداوار تھی۔یہ وہاں کے طبقہ شرفا کے دل کی آواز نہیں تھی اور نہ ہی خواص نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔بڑے بڑے ہم عصر شاعروں نے بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔مثلاً میر ، سودا، میر حسن ، نظیر اکبرآبادی اور بعد میں آتش، ناسخ ، مصحفی ، غالب ، ذوق اور مومن پر اس کے اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ہم عصر شعرا پر اس صنف کے اثرات کی عدم موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ یہ مخصوص منچلے اور آوارہ شعرا کی مخصوص ذہنیت کی پیداوار تھی۔مثلاً محسن کا ایک شعر اس حقیقت کی بڑی اچھی ترجمانی کرتاہے۔

نام محسن ہے بوا عرف ہے عنقا بیگم
ہے نئی طرز کا چلتا ہوا منہ پھٹ عاشق (۵۲)

ریختی کے ان منہ پھٹ عاشقوں کی طرح اس کے سننے والوں اور داد دینے والوں کا حلقہ بھی کافی محدود تھا۔اور مستند شعرا کی اس غیر سنجیدہ صنف کی طرف نظر التفاف سے نہ دیکھنے کا نتیجہ تھا کہ یہ ہماری شعری روایت کا حصہ نہ بن سکی ۔لیکن اس صنف کو کچھ توانا اقدار کے ساتھ اردو غزل کی روایت کا حصہ بننا چاہیے تھا اورشعرا کے ساتھ ساتھ

شاعرات(چاہے وہ طوائف ہی کیوں نہ ہوں ) کی اس صنف میں طبع آزمائی کی ضرورت تھی۔تاکہ ان کے مسائل انہی کی زبانی بیان ہو سکیں اور یوں اس میں صداقت کا عنصر داخل ہو سکے اور ان کے ساتھ صنفی امتیاز و استحصال سے کام نہ لیا جائے لیکن بدقسمتی سے ریختی ان روایات کی امین نہ بن سکی۔اس کے باجود ریختی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں ہے اس لیے کہ اس میں اس دور کے لکھنو کا طوائفانہ کلچر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ محفوظ ہو گیاہے۔اس کلچر کی ترجمانی مرد کی زبان سے ہوئی ہے لیکن اس کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے اس دور کی عورت اور بالخصوص طوائف کی کئی ایک پریشانیوں ، خدشات ،نفسیات اور مسائل کی تفہیم ممکن ہے۔اس لیے کہ اس سے متعلقہ شاعروں نے اپنی زندگی کا اچھا خاصا حصہ طوائف کے کوٹھوں پر گزارا تھا اور بیگمات کی زندگی کو انہوں نے کافی قریب سے دیکھا تھا۔ریختی کی اہمیت کا ایک حوالہ اس کا مخصوص اسلوب بھی ہے جس پر علیحدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ریختی کی زبان باقی تمام کلاسیکی اصناف کی زبان سے مختلف ہے۔اس میں ہمیں اسلوب کا ایک نیا ذائقہ محسوس ہوتاہے۔یوں نسائی لب و لہجے کی کامیاب عکاسی کے حوالے سے بھی یہ صنف اہم ہے اور بیگمات کے مخصوص روزمرے اور محاورے کے استعمال کی بنیاد پر لسانیاتی حوالوں سے ریختی اہمیت کی حامل صنف بنتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ریختی میں ایسے مضامین باندھے گئے ہیں جو شائستہ مزاج قارئین کی توجہ حاصل نہیں کر سکتے لیکن ان شہوانی اور فحش اور غیر مہذب اور ناشائستہ مضامین کے اس ڈھیر میں بھی کچھ جواہر پارے موجود ہیں جس کی تلاش کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔پھر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ اس میں شریف زادیوں کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔جو بھی کردار موجود ہیں ان سب کا تعلق بازارحسن سے ہے۔ان کی روزمرہ زندگی ، رویے ، لباس ، خوش اعتقادیاں اور ضعیف الاعتقادیاں ، مذہبی جذبات ، معاشی اور سماجی مسائل کی طرف ریختی میں توانا اشارے ملتے ہیں۔ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس کیا جاسکتاہے کہ جسم ان کاذریعہ معاش ضرور ہے اور ان کی تصویر ان کی اپنی زبانی بھی پیش نہیں کی گئی بلکہ مرد شعرانے ان پر لکھا ہے ، اور انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ بھی نہیں لکھا بلکہ سستی شہرت ، معاشی فوائد اور وقت گزاری کی خاطر لکھا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اشعار میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ طوائف کے ہاں بازاری زندگی سے نجات حاصل کرنے کی ایک لاشعوری خواہش دکھائی دیتی ہے۔اس خواہش کی تکمیل کے حوالے سے مختلف اشعار میں کچھ تلخ تجربات بھی پیش ہوئے ہیں۔اس لیے کہ ان کے ساتھ شادی کے لیے شریف لوگ تیار نہیں ہوتے بلکہ ایسے لوگ تیار ہوتے ہیں جو ان کے کفن کا چونگا تو کر لیتے ہیں لیکن ان کی پہلے کئی ایک شادیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔لہٰذا سوتنوں کے ساتھ زندگی گزارنا طوائف ہونے سے زیادہ تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ان تلخ تجربات کی عکاسی کے حوالے سے بھی ریختی کی اہمیت میں اضافہ ہوتاہے۔

لکھنوی ریختی پر ہماری تنقیدی اور تاریخی کتابوں میں جس سب و شتم سے کام لیا جاتا ہے مناسب نہیں۔اس دور کا لکھنو ، وہاں کا تہذیبی ماحول ،گلی کوچوں میں طوائفوں کی فراوانی ، نسائی تہذیبی رنگ ، عیاش بادشاہ اور ان کا فروغ دیا ہوا مخصوص عیاشانہ کلچروغیرہ جیسے زمینی حقائق سامنے رکھے جائیں تو اس میں عورتوں کے جذبات کی ترجمانی اسی کجروی کے ساتھ ہی ہوسکتی تھی۔دراصل ریختی کو ان ادبی اقدار کے ساتھ زندہ کرنے کی ضرورت تھی جن ادبی اقدار کے ساتھ ہاشمی بیجاپوری نے "اوئی کی غزل" کہہ کر اس کی بنیاد رکھی دی تھی۔لکھنو نے اسے دکنی روح کے ساتھ زندہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ آج بھی عورتوں کے لیے ایک ایسی ہی مخصوص صنف کی ضرورت ہے جو ان ہی کے لب و لہجے ، روزمرے اور محاورے میں انہی کی آوا زعوامی حلقوں کو پہنچانے کی ضامن بن سکے۔لکھنوی ریختی یہ فریضہ سرانجام دے سکتی تھی لیکن بوجوہ یہ محض طوائفوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔آج کی ریختی میں دکن گھلا ملا ہونا چاہیے اور لکھنو بھی اور اس کے علاوہ جدید دور، اس کے مسائل اور مخصوص جغرافیوں اور تہذیبوں کے اندر رہتی ہوئی عورت کے مختلف رنگوں کی عکاسی بھی ہونی چاہیے تاکہ ریختی ہر ایک عورت کے جذبات کی حقیقی ترجمان بن سکے۔یہ کام اب شعرا کو نہیں کرنا چاہیے بلکہ آج کی جدید شاعرات کو نئے ادبی اقدار کے ساتھ اس صنف کی دوبارہ احیا کے لیے سنجیدہ کوشش کر لینی چاہیے۔

## حوالہ جات:


۱۔ کوثر چاند پوری ،ریختی اور اس کے فنکار، مشمولہ ،اردو شاعری کا فنی ارتقاء ، فرمان فتح پوری ، ڈاکٹر، الوقار پبلی کیشنز ، واپڈا ٹاؤن ، لاہور، ۲۰۱۵ء ،ص،۳۹۲۔

۲۔ صابرعلی خان ، ڈاکٹر ، سعادت یار خان رنگین ،انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۵۶ء۔ص، ۴۰۶

۳۔ مجید یزدانی ، سعادت یار خان رنگین ، مشمولہ ،تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند(ساتویں جلداردو ادب دوم )، پنجاب یونیورسٹی لاہور۱۹۷۱ء ،ص، ۳۲۴

۴۔ ایضاً،ص، ۳۲۵ ۵۔ایضاً،ص، ۳۲۵

۶۔ صابرعلی خان ، ڈاکٹر ، سعادت یار خان رنگین ،انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۵۶ء۔ص، ۴۰۶

۷۔ فاروق ارگلی،صنف ریختی پر ایک نظر،مشمولہ ریختی ، مرتبہ فاروق ارگلی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص، ۱۲

۸۔ دیوان جان صاحب (اول )فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص، ۲۶۵

۹۔ ایضاً، ص، ۲۶۸ ۱۰۔ایضاً، ص، ۲۹۴ ۱۱۔ایضاً، ص، ۲۸۹ ۱۲۔ایضاً،ص، ۳۲۰

۱۳۔ دیوان رنگیلی بیگم (محسن خان محسن)فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص،۶۰۷

۱۴۔ دیوان جان صاحب (اول )فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص، ۳۱۵
۱۵۔ ایضاً، ص، ۳۴۰
۱۶۔ دیوان رنگیلی بیگم (محسن خان محسنؔ)فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص،۶۳۰
۱۷۔ دیوان جان صاحب (اول )فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص، ۳۱۲
۱۸۔ دیوان رنگیلی بیگم (محسن خان محسنؔ)فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص،۵۴۲
۱۹۔ ایضاً، ص،۵۴۹ ۲۰۔ایضاً، ص،۵۶۴ ۲۱۔ ایضاً، ص،۵۸۸ ۲۲۔ ایضاً، ص،۶۵۶
۲۳۔ دیوان جان صاحب (اول )فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص، ۲۸۰
۲۴۔ دیوان رنگیلی بیگم (محسن خان محسنؔ)فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص،۶۳۰
۲۵۔ ایضاً، ص،۵۵۰ ۲۶۔ایضاً، ص،۶۲۵ ۲۷۔ایضاً، ص،۶۱۹
۲۸۔ ایضاً، ص،۵۵۱ ۲۹۔ایضاً، ص،۵۵۴
۳۰۔ دیوان جان صاحب (اول )فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص، ۲۷۲
۳۱۔ ایضاً، ص، ۲۸۶ ۳۲۔ایضاً، ص، ۲۹۲ ۳۳۔ایضاً، ص، ۲۸۲ ۳۴۔ ایضاً، ص،۲۸۵
۳۵۔ دیوان رنگیلی بیگم (محسن خان محسنؔ)فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص،۵۷۷
۳۶۔ ایضاً، ص، ۶۰۲
۳۷۔ دیوان جان صاحب (اول )فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص، ۳۴۳
۳۸۔ ایضاً، ص، ۳۲۷ ۳۹۔ایضاً، ص، ۲۷۹ ۴۰۔ایضاً، ص، ۲۹۵
۴۱۔ ایضاً، ص، ۳۱۹ ۴۲۔ایضاً، ص، ۳۳۵ ۴۳۔ایضاً، ص، ۳۳۹،۳۴۰
۴۴۔ دیوان رنگیلی بیگم (محسن خان محسنؔ)فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص،۶۲۱
۴۵۔ ایضاً، ص،۶۴۳ ۴۶۔ایضاً، ص،۶۴۹ ۴۷۔ایضاً، ص،۶۲۴
۴۸۔ ایضاً، ص،۶۲۶ ۴۹۔ایضاً، ص،۶۵۷ ۵۰۔ایضاً، ص،۶۶۰
۵۱۔ تمکین کاظمی ، مرتب، تذکرۂ ریختی ، شمس الاسلام پریس ، چھتہ بازار، حیدرآباد دکن ، ۱۹۳۰ء۔ص ، ۱۴،۱۵
۵۲۔ دیوان رنگیلی بیگم (محسن خان محسنؔ)فاروق ارگلی(مرتب) ریختی ، فرید بکڈپو لمیٹڈ، دہلی ، ۲۰۰۶ء۔ص،۶۱۱

☆☆☆☆☆